زیادہ۔جتنی جلدی چھٹکارا ہو جائے اتنا ہی اچھا۔''

''خوب''۔۔۔۔۔۔۔۔مسٹر بھومکا نے کہا۔''مدراس میں تمھارے ایسے سور بیر بہت کم ہوتے ہیں۔''

''اچھا'' کہہ کر شقو خاموش ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا، مہندڑ کے چھدرے چھدرے پودوں میں سے اس نے سڑک پر گزرنے والے اِکّا دکّا ٹانگوں کو دیکھا جو بڑی تیزی سے بھاگ رہے تھے۔پھر اس کی نگاہیں نیم کے درختوں تلے کنچے کھیلنے والے لڑکوں پر جم گئیں جو ایک دوسرے کو سالا سالا کہہ کر بہن کی گالیاں دے رہے تھے۔۔۔۔۔۔

''شیو کرو گے؟'' بیٹرس اندر داخل ہوئی۔

''اوں ہوں۔''

''کیوں؟''

''دل نہیں چاہتا۔۔۔۔۔۔بڑھی ہوئی شیو چہرے کی ہیبت کم کر دیتی ہے۔''

''پھر وہی بات۔۔۔۔لیکن تمھارے چہرے پر ہیبت ہے کہاں!''

''دیکھو بیٹرس پھر تم نے جھوٹ بولا۔''

''یہ جھوٹ ہے!۔۔۔۔۔۔۔کسی سے پوچھ لو۔یہ جھوٹ نہیں۔تمھارا چہرہ بہت اچھا ہے۔بہت خوب صورت۔کسی سے پوچھ لو۔۔۔ذرا سی کمزوری ہے۔وہ بھی دُور ہو جائے گی۔''

''بیٹرس''شقو نے محبت بھرے لہجہ میں کہا۔''کبھی سورج مغرب سے برآمد ہوا ہے؟ کبھی جوالا مکھی کے ہونٹوں سے میٹھے سوتے پھوٹے ہیں۔۔۔۔۔۔نہیں! تو پھر ٹی بی کا مریض کیسے بچ سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں۔میں تمہیں ریکارڈ بک لا کے دکھاتی ہوں۔۔۔۔۔اور پھر تمھیں ٹی بی کہاں۔''

''پھر وہی بات۔۔۔۔اچھا یہ بتاؤ میں مروں گا کب؟''

''شش!'' بیٹرس نے لبوں پر انگلی رکھ کے کہا۔''ایسے نہیں کہا کرتے۔''

''کیوں؟''

''بس یونہی۔''

''یونہی کیوں، آخر کوئی بات بھی تو ہو۔''

''ہوتی ہے ایک بات۔۔۔سسٹر خفا ہوتی ہے۔''

''۔۔۔۔۔۔سسٹر نہ سسٹر۔۔۔۔۔وہ خفا ہوتی ہے تو میں روز ایسے کہوں گا اور زور زور سے کہوں گا۔۔۔۔۔''

''اچھا اگر میں برا مانوں تو؟'' بیٹرس نے پیار بھری نظروں سے اسے دیکھا۔شقو نے اپنا لاغر ہاتھ اٹھا کر بیٹرس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا۔''نہیں۔''

بیٹرس نے اس کا ہاتھ سہلا کر کہا۔ ''تم بڑے اچھے ہو۔ اب تم جلد راضی ہو جاؤ گے۔''

''اچھا۔'' شقو نے ہولے سے کہا اور بیٹرس کو دیکھنے لگا۔ اس کے سرخ اور رسیلے ہونٹ، صحت منداور جانفزا جسم، خون کی حدّت سے تمتمایا ہوا چہرہ اور جوانی بھری آنکھیں جن میں موتی کوٹ کوٹ بھرے تھے۔ آج اسے بہت بُری لگیں۔ پہلی مرتبہ اسے اپنی کمزوری کا احساس ہوا۔ بیٹرس کا وجود اسے ایک گالی کی دکھائی دینے لگا جو دنیا کے تندرستوں مریضوں کو دی ہو۔ نہایت ہی بھیانک اور حد درجہ ہتک آمیز! ہر نرس ایک گالی ہے گالی، جگر سوز۔ روح فرسا! پھر وہ محبّت بھری آنکھیں بیٹرس کے مرمریں چہرے کو جس میں کامرانی جھلک رہی تھی انتقام اور غضب سے گھورنے لگیں۔ نجانے کیوں بیٹرس کی آنکھیں میں پانی بھر آیا۔ شقو چلّانے لگا۔

''بیٹرس! بیٹرس!۔۔۔۔۔۔ روکو ان آنسوؤں کو۔۔۔۔۔۔ دیکھو یہ مجھے ڈبونے آ رہے ہیں۔ میں ان کے ریلوں کی تاب نہیں رکھتا۔ یہ مجھے خس و خاشاک کی طرح بہالے جائیں گے۔ ہٹاؤ! ہٹاؤ! پونچھو! پونچھو!'' بیٹرس اٹھ کر چلی گئی اور پتہ نہیں وہ بدلی کہاں جا کر برسی۔

''میرا دل تو اب بھی یہی چاہتا ہے۔'' چچی نے پنکھا جھلتے ہوئے کہا۔

''کیا۔'' چچا بولے۔

''یہی کہ کنیز کی شادی اب بھی شقو سے ہو جائے۔''

''واہ پاگل ہوئی ہے۔ وہ بیچارہ پتہ نہیں کے دن کا مہمان ہے اور لگی ہے بیاہ رچانے۔''

''اوئی توبہ ایک دن کے لیے بھی ہسپتال سے نہیں آ سکتا۔''

''اوں ہوں۔''

''اور اس کے زمین بھائی لے جائیں گے؟''

''اور کیا تم!''

''میری قسمت میں کہاں۔ کنیز کا مقدّر اچھا ہوتا تو جبھی بات کھول لیتے۔ مگر کرموں کے لکھے کو کون میٹ سکتا ہے۔''

''خدا کارے ہمارا شقو لاکھوں برس کی عمر پائے۔۔۔۔۔ یہ زمین اس کے چچا کو نہیں مل سکتی؟''

''نہیں۔ بھائی جو ہیں۔''

''کسی بھی طرح نہیں۔''

''نہیں۔''

''سرکار دربار جا کر بھی نہیں۔''

''ایک دفعہ جو کہہ دیا نہیں۔'' چچا بھنا کر بولے۔

''یا خدا میرے شقو کی خیر۔ اللہ آمی کر کے اتنا بڑا کیا ہے۔ گیارہویں والا کرے۔ سونے کے سہرے لگیں۔'' وہ پھر پنکھا جھلنے لگیں

اور چچا اخبا آگے رکھ کر دانتوں میں تنکا پھیرنے لگے۔

''وہ کب مارو گے۔ وہ چھاپہ؟'' بیٹرس نے ہنس کر پوچھا۔

''وہ بتا کر تھوڑی مارا جاتا ہے۔۔۔۔۔ ہی تو چوری کا معاملہ ہے۔'' شقو نے اپنا ہاتھ اس کی کہنی پر رکھا تو وہ تڑپ گئی۔

''کیوں؟'' شقو نے متحیّر ہو کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔ زخم ہو گیا۔''

''کیسے۔''

''ایسے ہی۔''

''ایسے کیسے۔''

''ڈاکٹر شاہ نے خون نکالا تھا۔۔۔۔۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں!''

''میرے لیے؟''

''پتہ نہیں۔''

''بتاؤ، بیٹرس!'' شقو نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر التجا کی۔

''مجھے خبر نہیں۔'' وروہ اٹھ کر چل دی۔

شام کو مسٹر بھومکا کا بیڈ خالی ہو گیا۔ کامریڈ اصغر نے ہنس کر کہا۔ ''لو یہ اس بیماری کے علاج کا منتظر تھا۔ یہ گرمیاں اور اس کے بعد اور اس کے بعد کی گرمیاں اور پھر ٹی بی کا علاج ہو سکے گا۔'' اور جب اس کا اسٹریچر کامریڈ کے قریب سے گزرا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''بہت کمزور پرولتاری تھا۔ ہر کمزور پرولتاری مر جائیگا۔ ہر نحیف ونزار محکوم اور مجبور محنت کش ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد جواں مرد اور توانا پرولتاری پیدا ہوں گے۔ سرخ آندھی آئے گی اور سارے بورژوائی قتل ہو جائیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔'' اسے کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ کھانستے کھانستے بیحال ہو گیا۔

جب ڈاکٹر انجکشن دے چکے تو شقو نے آنکھیں کھول کر پوچھا۔ ''یہ کیسا ٹیکا تھا ڈاکٹر صاحب!''

''خون کا۔''

''کیسے خون کا؟''

''یہ بیٹرس نے تمھارے لیے دیا تھا۔۔۔۔۔ اپنی مرضی سے۔''

جب ڈاکٹر جا چکا تو شقو نے سامنے کی الماری میں دھوئے دھائے برّاق نشتروں کو دیکھا جو بجلی کے خوابیدہ کوندوں کی طرح دکھائی

دیتے تھے۔اس کا بس چلتا تو فوراً ایک خاراشگاف نیچہ اٹھا کر اپنے پہلو میں گاڑ دیتا اور بیٹرس کے خون کے ساتھ اس کا اپنا لہو بھی بہہ جاتا، گر وہ اٹھ نہ سکا۔نشتر کیسے اٹھاتا؟

''سسٹر۔'' ڈاکٹر نے کہا۔''ٹوٹنی تھری کی کنڈیشن دیکھو۔یہ آج شام تک زندہ نہیں رہے گا۔اس کے گھر ابھی سے میمو بھیج دو۔۔۔۔کہاں ہے اس کا گھر؟''

''مانٹگمری۔'' سسٹر نے چارٹ پڑھ کر کہا۔

''اوہ مان ٹگمری۔۔۔۔۔۔بہت دُور ہے۔آج ہی میمو بھیجو، ابھی، اس کی کنڈیشن خراب ہے۔مان ٹگمری بہت دُور ہے اور کولڈ سٹوریج میں اب جگہ نہیں۔''

''بہت اچھا کہہ کر سسٹر نے چارٹ پھر لٹکا دیا۔

''خون لے سکتے ہو؟'' ڈاکٹر نے سپورن سنگھ سے پوچھا۔

''میرے بھائی کو لکھ دیجیے جناب۔وہ آجائے گا۔''

''کیا جوان ہے!''

''کسرتی، جناب!''

''کیا کام کرتا ہے؟''

''ہل چلاتا ہے۔کرایہ پر سامان لادتا ہے۔کشتی لڑتا ہے اور۔۔۔۔۔''

''اور کیا کرتا ہے؟''

''اور کچھ نہیں کرتا جناب۔''

''بہت خوب۔۔۔۔اچھا وہ تمہیں خون دے گا؟''

''کیوں نہیں، جناب۔وہ اپنا خون جو ہوا۔''

''سسٹر، اسے لکھ دو۔یہ پشینٹ پوگرس کرے گا۔ممکن ہے ری کور کر جائے۔''

''ویل ڈاکٹر۔'' کہہ کر سسٹر نے اس کا چارٹ اتار لیا۔

بیٹرس تھرمامیٹر والی نیلی شیشی لے کر اندر داخل ہوئی۔شقو نے اسے جالی کا دروازہ آہستہ سے بند کرتے ہوئے دیکھا۔وہ صبح سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے تھوڑا سا لُعاب اپنی چھاتی پر لگایا۔تھرمامیٹر لگا کر بیٹرس گریبان میں ہاتھ ڈال کر اس کا سینہ سہلانے لگی۔

''یہ کیا؟'' اس نے اپنی ہتھیلی نکال کر پوچھا۔

''پتہ نہیں۔''

''شاید رال ہے۔مگر یہ یہاں کیسے پہنچی۔۔۔۔۔تمھاری گردن تو درد نہیں کرتی؟''

''نہیں۔''شقو نے جواب دیا۔بیٹرس اٹھی اور کونے میں رکھی ہوئی چلمچی میں اپنا ہاتھ دھونے لگی۔ہاتھ دھونے کے بعد اس نے اپنے گریبان سے رومال نکالا اور اسے شقو کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دیا۔

سسٹر نے کہا۔''ایک عورت تمہیں ملنے آئی ہے۔''

''آنے دو۔''شقو نے جواب دیا۔''گو میں بہت تھک گیا ہوں پر اپنوں سے ملنے کو دل بہت چاہتا ہے۔جہلم والی خالہ اندر داخل ہوئیں وہ ناک پر رومال رکھے سہمی سہمی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔

''تم بہت کمزور ہو گئے ہو،شقو۔''خالہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

''ہاں،خالہ۔۔۔۔۔یہ بیماری ہی کچھ ایسی ہے۔ایک دم ختم نہیں کر دیتی۔۔۔۔۔ہاں سچ میں آپ کی کیا خدمت کروں؟ یہاں سوائے کڑوی کسیلی دواؤں اور آبدار نشتروں کے اور کچھ بھی نہیں۔''پھر شقو ہنسا اور اس کی ہنسی کھوکھلی تھی۔

''میں تو صرف تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔ایک عرصہ سے دل ترس رہا تھا۔تمھارے چوخانے کوٹ والا فوٹو دیکھ کر رو لیا کرتی ہوں۔''

''رویا نہیں کرتے،خالہ۔''شقو نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''آخر کیوں رویا جائے؟''

خالہ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکیں اور رومال ناک سے پرے ہٹا کر اسے بغور دیکھنے لگیں۔آج پہلی مرتبہ ان کا دل چاہا کہ وہ شقو سے لپٹ کر اونچے رونے لگیں۔سیمنٹ کے صاف شفاف اور ٹھنڈے فرش پر کھڑے کھڑے انہیں شقو کا بچپن یاد آ گیا۔وہ ہمیشہ اسے کندھے پر اٹھائے پھرتیں تھیں۔اپنے جیب خرچ سے اس کے لیے کھلونے لاتیں اور جب ان بڑی بہن شقو کو مارنے لگتیں تو وہی آڑے آتیں۔پھر ان کی شادی ہو گئی اور انھوں نے سب سے زیادہ چیخیں شقو سے جدا ہوتے وقت ماریں!سسٹر پاس آ کر کھڑی ہو گئی تو خالہ نے کہا۔''یہ میرا بھانجا ہے،نرس۔بہت اچھا تیراک تھا۔پانی میں مچھلی کی طرح لچکتا رہتا۔میں بڑے شوق سے اس کی تیراکی دیکھتی تھی۔یوں تو مجھے اپنی ساری اولاد سے زیادہ اپنے بھانجے بھانجیوں سے اُنس ہے پر اس سے بہت زیادہ محبت تھی۔یہ دیکھو۔''خالہ نے آستین چڑھا کر کہا۔''بچپن میں ایک دفعہ اس نے مجھے یہاں کاٹ کھایا تھا۔''شقو مسکرانے لگا۔''کہاں،خالہ؟''اس نے کہنیوں کے بل ہو کر پوچھا۔''مجھے تو یاد نہیں۔''

''ہاں تمہیں اب کہاں یاد ہو گا۔یہ تو بہت عرصے کی بات ہے۔''خالہ آگے نہ بڑھ سکیں۔شقو نے دیکھا۔ان کے کندھے پر چنبیلی کے پھول ایسا نشان تھا۔خالہ مڑنے لگیں تو بولیں۔''جاتی دفعہ پھر ملنے آوں گی۔اب چلتی ہوں۔رانی کو گھر اکیلے چھوڑ آئی ہوں۔اب گھٹنوں چلتی ہے۔دانت نکال رہی ہے۔اس دُور میں سارے بچّے اکثر بیمار رہتے ہیں۔''سسٹر خالہ کو برآمدے تک چھوڑنے گئی۔خالہ نے اسے دو روپے دیتے ہوئے کہا۔''میرے بھانجے کو کچھ لا دینا۔''

''تھینک یو۔''کہہ کر گلابی رنگ کا نوٹ اپنے گریبان کے اندر اڑس لیا۔شقو شیشے میں سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

شام کو مس نورا نے بتایا کہ آغا صاحب باہر آئے ہیں۔جب وہ کافی دیر تک اندر نہ آئے تو مِس نورا باہر گئی۔میں اندر نہیں

آ سکتا، جلدی میں ہوں۔ شقو سے پوچھو، اب کیا حال ہے۔'' جب وہ شقو کا حال بتا کر واپس آ گئی تو شقو نے پوچھا آغا صاحب کیا کہتے تھے۔ ''کچھ نہیں۔'' نورا نے جواب دیا۔

''وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے۔ سگریٹ پیش کی۔ مگر میں نے نو تھینکس کہہ کر لوٹا دی۔ کیا میں لے لیتی؟'' جب شقو نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ لمبی سانس کھینچ کر بولی ''تو ایبل ینگ مین۔ ٹاورنگ پرسنلٹی۔''

رات کے آٹھ بجے موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ سپورن سنگھ نے ٹونٹی تھری کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹ خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور آنکھیں حلقوں میں دھنس کر ناپید ہو چکی تھیں۔ سپورن سنگھ کا دل بھر آیا وہ چمکار کر بولا۔ ''ٹونٹی تھری۔''

''ہوں!'' اس نے آنکھیں کھول دیں۔

''اب کیا حال ہے؟''

''کچھ ٹھیک نہیں۔ میرے پھیپھڑوں میں شدّت کا درد ہے اور میرے حلق میں کڑوے کانٹے کھبے جا رہے ہیں۔''

''اوہو۔۔۔۔۔ معاف کرنا ٹونٹی تھری۔ کل ہم تمہیں دیکھ نہ سکیں گے۔ واہگورو کرے تمھارا وقت آسانی سے کٹے۔''

''ہاں ہاں۔'' ٹونٹی تھری آہستہ سے کھانسا۔'' اس میں معافی کی کونسی بات ہے۔ یہاں ہر ایک مرنے کے لیے آتا ہے اور، اور۔۔۔ پھر۔۔۔۔۔ اور۔'' وہ تھک کر خاموش ہو گیا۔

سپورن سنگھ نے کروٹ بدلی اور سو گیا۔

آدھی رات کو بارش اور تیز ہو گئی۔ بجلی زور سے چمکتی۔ پھر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ درختوں کی شائیں شائیں اور سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا کی آوازیں اِدھر اُدھر بھاگی پھرتی تھیں۔ وارڈ کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اندھیری رات میں کوئی بجرہ سمندر کی آغوش میں خوف ناک لوریاں سُن رہا ہو۔ نرس بوائے سٹریچر لے کر اندر داخل ہوا۔ دو نرسوں کی مدد سے اس نے سپورن سنگھ کو اس پر لٹایا۔ باہر برآمدے میں اس کا بھائی بارش سے بھیگا ہوا کھڑا تھا۔ وہ اس کے لئے خون دینے آیا تھا۔ جونہی سٹریچر اس کے پاس پہنچا۔ نرس بوائے نے کہا۔ ''اب خون دینے کی ضرورت نہیں رہی۔ اپنے اس خون کو بھی لے جاؤ۔'' اس کا بھائی سپورن سنگھ کی موت پر حیران نہیں ہوا۔ نرم لہجہ میں کہنے لگا۔ ''صبح اسے لے جاوں گا۔ اب تو بارش ہو رہی ہے۔''

''میں کب کہتا ہوں ابھی لے جاؤ۔۔۔۔۔ یہ صبح ہی ملے گا۔''

''ست بچن مہاراج۔'' اس نے مشکور ہو کر ہاتھ جوڑے۔ نرس بوائے سٹریچر دھکیلتا آگے چلا گیا۔

جب ٹونٹی تھری نے آنکھ کھولی تو بیڈ خالی تھا۔ واقعی سپورن سنگھ اس صبح اسے نہ دیکھ سکا۔ منٹگمری سے آئے ہوئے وارثوں کو بھیج دیا گیا۔

''آخر بیٹرس کو کیا حق ہے کہ سرُخ و سپید چہرہ لیے ہمارے درمیان گھومتی پھرے۔ خدا نے کیوں اسے صحت مند بنایا اور ہمیں بیمار! وہ اپنی جوانی، صحت اور تنومندی کی نمائش کر کے ہمارا مذاق اڑاتی ہے۔ اس کے لاشعور میں ہماری کمزوریوں اور بیماریوں کے خلاف تمسخر

ہے۔آخر کیوں اسے اتنا خون سونپا گیا ہے، کیوں ایسی زندگی عطا کی گئی ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟ رات بھر شقو کا مریڈا صغر سے باتیں کرتا رہا اور اب وہ ایک عجیب زاویہءنگاہ سے انوکھی باتیں سوچ رہا تھا۔

بیٹرس آئی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

''کیسے ہو؟'' بیٹرس نے پوچھا۔

''اچھا ہوں۔''

''آنکھیں کیوں نہیں کھولتے؟''

''ایسے ہی۔ مجھے اندھیارا اچھا لگتا ہے۔''

''میں سامنے کی کھڑکی پر شیڈ ڈال دوں؟''

''نہیں''

''کیوں؟''

''تمہیں کیا۔۔۔۔۔اپنا کام کرو اور جاؤ۔''

بیٹرس حیران رہ گئی۔منہ سے کچھ نہ بولی۔ٹمپریچر لے کر اور اس کے جوڑوں پر پوڈر چھڑک کر آگے چلی گئی۔اسے ڈر لگ رہا تھا کہ شقو اب صحت یاب نہ ہو سکے گا۔اس کا روکھا سا برتاؤ اور جوڑوں پر ہڈیوں کا خوفناک ابھار اس بات کی دلالت کرتے تھے کہ چراغِ سحری ہے۔جب وہ پوڈر چھڑک رہی تھی تو اس نے شقو کے کولھوں اور گھٹنوں پر بستر کی خراشیں دیکھی تھیں۔وہ اتنی گہری نہ ہوئیں تھیں۔معمولی تھیں۔مگر ان کے بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔بیٹرس نے رُوئی کے موٹے موٹے پیڈ ان کے نیچے دے دیے تھے اور خراشوں پر اچھی طرح سے جما دیا تھا۔

''بیٹرس۔'' شقو پکارا۔''ذرا ادھر آنا۔''

بیٹرس پاس گئی تو اس نے اپنا ماتھا چھو کر کہا۔''دیکھنا۔یہاں درد ہوتا ہے۔میں نے ابھی ہاتھ لگایا تھا۔پکے ہوئے پھوڑے کی طرح دکھتا ہے۔'' جب وہ جھک کر اسے دیکھنے لگی تو شقو نے اپنا تعفن بھرا سانس اس کے چہرے پر چھوڑ دیا'' کچھ پتا نہیں چلتا۔'' بیٹرس نے اِدھر اُدھر سے دبا کر دیکھا۔

''پھر دیکھا۔'' شقو نے کہا اور وہ پھر جھکی۔اس دفعہ بھی اس نے اپنا جراثیم بھرا سانس اس کے شہابی رخ پر گھٹا کی طرح پھیلا دیا مگر اس نے محسوس تک نہ کیا۔شقو کی سازش مستور رہی۔

وہ چلی گئی تو شقو سوچنے لگا کہ سانس تو ایک بے معنی سی عارضی چیز ہے۔

دوسرے دن اس کی حالت دگر ہو گئی۔دن کئی بار خون تھوکا۔تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا۔گالوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔آنکھوں کے حلقے سیاہ ہو کر اندھے کنوئیں بن گئے۔کان کی لویں کنول کے مرجھائے ڈنٹھلوں کی طرح سنولا گئیں۔انگل انگل ڈاڑھی رال اور تھوک سے

چپک کر سیاہ بانات کا ٹکڑا بن گئی۔ آنکھوں میں غلیظ مادہ کثرت سے بھر گیا اور ہر سانس سے بو آنے لگی۔ اس کے روائی زخم اب گہرے ہو گئے تھے اور بستر کی رگڑ سے یوں دکھتے تھے جیسے کسی نے چٹکی بھر نمک ان پر چھڑک دیا ہو۔ کولہوں کی ہڈیاں پتلی سی جھلی میں لپٹی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں اور ان کے جوڑ عرصہ سے بند چوبی دروازوں کی طرح آوازیں نکالتے محسوس ہوتے تھے۔

جب بیٹرس ڈاکٹر شاہ کو ساتھ لے کر آئی تو انھوں نے کہا۔ ''حیرت ہے یہ ابھی تک زندہ ہے۔'' بیٹس کچھ کہہ نہ سکی۔ ڈاکٹر کو دیکھتی رہی۔

''خون کا ایک انجکشن اور دو گی؟''

''ضرور!'' بیٹرس نے بازو آگے بڑھا کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے خون ٹیوب میں کھینچ کر سرنج بھر لی اور شقو کے بازو میں گھونپ دی۔ جب ٹیکہ لگ چکا تو ڈاکٹر نے کہا۔ ''اس کا خیال رکھو اور ایک گھنٹہ بعد مجھے اطلاع۔''

جب شقو نے آنکھیں کھولیں تو بیٹرس کے بازو سے خون رستا دیکھ کر اپنے بازو کو دیکھنے لگا۔ اس پر سپرٹ سے تر روئی کی ۔۔۔۔۔ چھوٹی سی پھریری پڑی تھی۔

''آخر تم ہم مریضوں کو اس طرح کب تک ذلیل کرو گی؟'' شقو نے غصّہ سے کہا۔ لیکن بیٹرس چپ رہی۔ جیسے سنا ہی نہیں۔ پھر وہ باہر دیکھنے لگی اور اس انداز میں بیٹھ گئی گویا اب بولے گی بلکہ بول ہی نہ سکے گی۔

شقو کو یہ مکّار بھیگی بلّی بہت بری لگی۔

''ذرا اپنا پن دینا۔'' شقو نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ بیٹرس نے گریبان سے پن نکالا اور اسے دے دیا۔ لیکن خود اسی طرح بیٹھی رہی۔ شقو کو معلوم تھا کہ بیٹرس جب چارٹ بھرنے آتی ہے اور اس کے ایک ہاتھ میں نیلی شیشی ہوتی ہے۔ تو وہ پن ہمیشہ منہ سے کھولتی ہے۔ آخر اسے اس طرح صحت مند رہنے کا کیا حق ہے۔ شقو نے سوچا اور پن کا سر پوش اپنے منہ میں ڈال کر خون سے لتھڑ دیا۔ جب وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پن بیٹرس کو لوٹا رہا تھا تو اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں اور پن تپائی پر پڑی ہوئی، لائیسول، کی ٹرے میں گر پڑا۔ بیٹرس نے اسے اٹھایا نہیں ویسے ہی رہنے دیا اور باہر دیکھتی رہی۔ خون کے قطرے اب بھی اس کے بازو سے بیر بوٹی کی طرح چمٹے ہوئے تھے۔

ایک شدید قسم کا جذبہ تھا جو شقو کو زندہ رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ ایک نامکمل سازش تھی جو اسے مرنے نہ دیتی تھی۔ وہ اپنے منصوبوں کو ڈھیتے ہوئے نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کی ساری کاوشیں اس کے سامنے ناکام ہو جائیں اور وہ مر جائے! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

وہ دن بڑی بے چینی سے گذرا۔ خون سے بھری رال اس کی باچھوں سے بہہ کر ڈاڑھی میں پھیل جاتی اور پھر وہاں سے گردن پر پہنچ کر بستر میں جذب ہو جاتی۔ آنکھیں ایسی بند ہوئی تھیں کہ کھلنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ سر پر چھدرے چھدرے مگر سخت بال بوتل صاف کرنے کا کرم خوردہ برش بنے ہوئے تھے۔ ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو چکا تھا اور ٹھوڑی نوک دار ہو گئی تھی۔ چرچراتی ہڈیوں کے سروں پر ہاتھ پاؤں پلّے کی لاش کی طرح پھولے ہوئے تھے۔ ان پر جلد اس سختی سے تنی ہوئی تھی کہ آماس میں منہ دکھائی دیتا تھا۔ روائی زخموں سے ملجگے رنگ کا مادہ بہتے

بہتے رک گیا تھا اور کولہوں کی ہڈیاں ذرا سی جنبش سے کڑکڑا اُٹھتیں۔

لیکن شام کو اس کی حالت بالکل غیر ہوگئی۔ پھیپھڑے پھڑ پھڑاتے ہوئے پھٹے جھنڈے کی طرح آواز دینے لگے۔ سانس کی نالی میں تنفس ایسے داخل ہوتا جیسے بھاری بھاری زنجیروں کو پتھروں پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ شقو نے محسوس کیا جیسے اس کے اندر مٹی کا تیل بھرے کنستروں میں اچانک آگ لگ گئی ہو۔ دھواں نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کڑوا کسیلا بدبودار دھواں۔ آگ کی حدّت اور پیلی پیلی روشنی کی چندھیائی ہوئی چھوٹیں کبھی اس کے سینہ کو چیر کر باہر نکلنا چاہتیں، اور کبھی دل اور پھیپھڑوں کے تکے توڑنے لگتیں۔ پاؤں کی سوجن میں خارش اور اینٹھن برسرِ پیکار تھیں۔ کولہوں اور گھٹنوں کے زخم چیونٹوں کے بل بنے ہوئے تھے۔ منہ سے گہرے اودے رنگ کا خون بہہ رہا تھا جیسے کلیجی گھل گھل کر نکل رہی ہو۔ تشنّج ہوتی اور جسم چھوئی موئی ہو جاتا۔ سارا بدن درد کی گانٹھ بن گیا تھا اور اب درد کہیں نہ تھا۔

ڈوردتھی نے اپنی ڈیوٹی سے الگ ہوتے ہوئے نورا سے کہا۔ ''تھرٹی ون کی چادر خون سے بھر گئی ہے۔ اسے بدل لینا۔'' لیکن نورا یہ سوچ کر چپ رہی کہ ابھی مِس تھاپر ڈیوٹی پر آئے گی تو چادر بدل جائے گی۔ مِس تھاپر نے نورا کو جاتے ہوئے یقین دلایا کہ چادر بدل دی جائے گی۔ کیوں کہ اسے پتہ تھا کہ ایک گھنٹہ تک بیٹرس آنے والی تھی اور وہ ہی ایسے کام دل لگا کر کیا کرتی تھی۔ کثیف اور غلیظ!

ڈاکٹر شاہ راؤنڈ پر آئے تو انہوں نے مِس تھاپر کو دروازہ میں بلا کر پوچھا۔

''تھرٹی ون ختم؟''

مِس تھاپر پنجوں کے بل شقو کے بستر کے پاس آئی۔ وہ اوندھے منہ لیٹا تھا۔ ذرا دیر ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے بعد وہ اسی طرح ڈاکٹر کے پاس واپس چلی آئی۔

''کیوں؟'' ڈاکٹر نے آنکھیں گھما کر پوچھا۔

''ابھی نہیں!'' مِس تھاپر نے جواب دیا اور کنکھیوں سے مسکرانے لگی۔

شقو کو اوندھے منہ لیٹے دیکھ کر بیٹرس تڑپ گئی۔ اس نے اس کا چہرہ اوپر کیا اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ شقو نے اپنی آنکھیں بڑی مشکل سے کھولیں اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے بیٹرس کو گھورنے لگا۔ اس کی کھانسی میں چھوٹے چھوٹے بلبلے پھٹ رہے تھے اور اس کے سانس میں مدھم سیٹیاں بج رہی تھیں۔

''بیٹرس۔'' شقو نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔''

بیٹرس نے آہنی چارپائی کی پشت کو اٹھایا اور وہاں تکیہ لگا دیا۔ پھر شقو کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس نے پشت کے سہارے اسے چارپائی پر بٹھا دیا وہ اسی طرح بغیر پلک جھپکے چھت کو تکے گیا۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھیں یوں کھلی ہوئی تھیں جیسے طویل و تاریک سرنگوں کے اگلے دہانے!

''تم آج اتنے پریشان کیوں ہو؟'' بیٹرس نے اسے مضمحل دیکھ کر پوچھا۔ ''کوئی یاد آ رہا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر تم اداس کیوں ہو؟''

''یونہی۔ایسے ہی!''

''خالد یاد آتا ہے؟''

''نہیں!''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''باجی''

''اوں ہوں!''

''تو پھر کیا ہے؟ بتاؤ نا۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ لڑکی یاد آ رہی ہے جس کی شبِ برات کو پیشانی چومی تھی؟''

''ہوں؟ اوں ہوں!''

''دل میں کوئی راز چھپا ہے؟''

''نہیں!''

''کوئی ارمان ہے؟''

''ہاں!''

''کیا؟''

''پتہ نہیں۔''

وہ ایسے ہی چھت کو دیکھے گیا اور بیٹرس خاموش ہوگئی۔نرس بوائے نے آ کر پوچھا۔''تھرٹی ون زندہ ہے؟''تو بیٹرس نے رونکھی ہو کر اسے باہر دھکیل دیا۔ڈورئین اپنی ڈیوٹی پر آئی تو بیٹرس نے کہا۔''جاؤ تم سو رہو۔تمھاری جگہ میں ڈیوٹی دوں گی۔''

''تھینک یو۔''ڈورئین نے اسے کندھے سے پکڑ کر کہا۔''آج میرا کزن آیا ہے اور میں ابھی اس سے بڑی لذیز باتیں کرتی آئی ہوں۔''

شقو اسی طرح پشت کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔اس کی آنکھیں ویسے ہی چھت میں گڑی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ اب بھی پیٹ پر پڑے تھے۔بیٹرس سٹول کھینچ کر شقو کی چارپائی سے لگ کر بیٹھ گئی۔اتنی شدید ڈیوٹی۔منٹ منٹ بعد لمبے لمبے چکر اور مکمل رت جگا۔بیٹرس نے اپنا ایک کندھا اسی آہنی چارپائی کی پشت سے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔لمبے لمبے سانس چلے اور پھر ننھے ننھے خرّاٹے ان ہونی موسیقی کے نومولود بچوں کی طرح ہمکنے لگے۔شقو نے مڑ کر دیکھا۔بیٹرس سو رہی تھی اور اس کا سکارف لجلجا ہو کر لٹک گیا تھا۔اس کے بازوؤں میں خون سے بھری شریانیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اور اس کے ہونٹ چشمہء حیوان کی روپہلی مچھلیوں کی طرح لچک رہے تھے۔وہ خاموش تھی۔بلب چپ چاپ اپنی روشنی بکھیرے جا رہا تھا اور پنکھا ایک ہی رفتار سے آہستہ آہستہ گھوم رہا تھا۔شقو نے اِدھر اُدھر دیکھا۔کوئی سو رہا تھا اور کوئی مر چکا تھا۔وہ اپنے سوجے ہوئے ہاتھوں پر بوجھ ڈال کر اٹھا۔ہڈیاں چرچرائیں۔سارا ڈھانچا چیخا اور سانس اُکھڑ گیا۔اس نے جلدی سے اپنے خون اور رال سے لتھڑے ہوئے منہ کو بیٹرس کے لبوں پر رکھ دیا۔زور لگانے پر بھی وہ اس کے لبوں اپنے منہ میں نہ کھینچ سکا

اور وہیں پٹی پر لٹک گیا۔ گلے کے گرد لپٹا ہوا غلیظ موم جامہ نیچے ڈھلک گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ اگر کامریڈ اصغر زندہ ہوتا تو ضرور اسے ''بہادر پرولتاری'' کے نام سے پکارتا۔

اگلے دن ماموں نذر نے بوٹی میاں کو آدمیوں سے ایک طرف لے جا کر کہا۔

''قبر ذرا گہری کھدوانا۔ یہ مرض بڑا نامراد ہوتا ہے۔''

تو تا کہانی

ایک دن کاشی کی سمت اے آنے والے بادل نہ جانے ادھر کیسے چلے آئے کہ سارا شہر اندھیارے کی لپیٹ میں آ گیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ہم چاروں دوست ہوسٹل کے ایک کمرے میں سٹوو لیمپ کے اردگرد کیتلی اسے اٹھتی ہوئی بھاپ میں اپنے سگرٹوں کا دبیز دھواں ملا ملا کر نظارہ کر رہے تھے۔سخت سردی میں ایسی شدید بارش کھڑکی کے شیشوں پر پتہ نہیں کونسی گت بجا رہی تھی اور دریچوں کے جھنجھناتے ہوئے پٹ معلوم نہیں کیا تال دے رہے تھے۔ہمیں تو اتنا یاد ہے کہ برکھا کی مینڈک ایسی ٹھنڈی رانی بار بار ہمارے منہ چوم کر خنکی حاصل کرنے کے لیے کسی چور دروازے سے باہر نکل جاتی تھی اور ہمیں یوں محسوس ہونے لگتا تھا جیسے ہم کسی بے پیندے کی کشتی میں کرسمس کارڈوں والی نیم برفیلی جھیلیں تیزی سے طے کر رہے ہوں۔

جب ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ ہمارے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر کھڑا ہو گیا تو حامد نے کہا۔''تم نے میرا جو کارنامہ سننے کے لیے مجھے یہاں چائے کی دعوت دی ہے وہ اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا ایثار ہے جو میں ایک عفت مآب لڑکی کی خاطر کر سکا۔شاید تم میں اسے سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو لیکن اس کی برتری کے تم یقیناً قائل ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اور میرا ایک ساتھی ایک باورچی کے ساتھ کرشن نگر کے ایک ایسے مکان میں رہتے تھے جس کے پڑوس میں ایک کنبہ آباد تھا۔ہم میں باروچی کے سوا کسی نے بھی ایڑیاں اُٹھا کر دیوار کے اس پار جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔اس پر بھی وہ لوگ ہمیں شریف نہ سمجھتے تھے اور السلامُ علیکم کا جواب بڑی تلخی سے دیا کرتے تھے۔خجستہ بڑی بڑی آنکھوں والی سانولے رنگ کی ایک ایسی لڑکی تھی۔جس کے سینڈل کی چوبی ایڑیاں باہر سے کافی گھسی ہوئی تھیں اور جب وہ چلتے ہوئے ایک قدم اُٹھاتی تو دوسرے پاؤں کی ایڑی جسم کے بوجھ سے پیچھے کو پھیل جاتی اور جب وہ اس قدم کو اُٹھاتی تو وہی چوبی ایڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھتی۔اس سے تمہیں اس کے جسم کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا۔اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔خجستہ کا باپ پتہ نہیں کس دفتر میں ملازم تھا مگر اس کی ماں دل کے عارضہ کی پرانی بیمار تھی اور ایک ایسی حاکم تھی جو ہر گھریلو کام کی فائل پر''فوری'' کی چٹ لگا دیا کرتی تھی۔

حیدر آباد سندھ سے خجستہ کی پھوپھی صرف بات پکی کرنے یہاں آئی تھیں اور بہت دنوں سے یہیں رہ رہی تھیں۔ایک دن دوپہر کو انہوں نے جہانگیر کے مقبرے کی سیر کا پروگرام مرتب کیا جو میں اپنے کوٹھے پر سے بغیر ایڑیاں اُٹھائے سن لیا۔

خجستہ سے میری ملاقات بس یونہی سرسری تھی۔میں اپنے کوٹھے پر آنے کا اعلان شیلی کے اشعار سے کیا کرتا اور وہ اپنی چھت پر آ کر زور سے پکارتی ''سارے کپڑے اتار لاؤں امّی ؟'' اور ہماری ملاقات ہو جاتی۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ الگنی پر ڈالا ہوا ان کا کوئی رومال سوکھ کر ہوا سے اڑتا ہوا ہمارے کوٹھے پر آ جاتا اور میں اس کی آمد کی خبر پا کر رومال کی گیند اپنے کوٹھے اس ان کے یہاں پھینکتا اور کہتا۔''آپ کا رومال ہے۔اڑ کر ہمارے یہاں پہنچ گیا تھا۔'' لیکن اس کے جواب میں صرف ''شکریہ'' کا ایک لفظ وصول ہوتا۔میرے ساتھی کو دیرینہ زکام کی شکایت تھی۔وہ میرے اس طرح رومال لوٹا دینے پر بہت بے چین ہوتا اور کثر ایک ہی قصّہ سنایا کرتا کہ کس طرح اس نے ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا منصوبہ باندھا اور اسے اس ارادے سے باخبر کر کے اس کی اجازت حاصل کی اور پھر جب وقت مقررہ آ پہنچا

اور اس لڑکی نے ڈیوڑھی کا دروازہ رات بھر کھلا رکھا تو وہ دبے پاؤں ان کے گھر میں داخل ہوا اور ٹٹولتے ٹٹولتے انکی ایک اصیل مرغی اغوا کر کے لے گیا جسے اس نے لونگ اور جائفل کا بگھار دے کر صبح شام دو وقت ضیافت اڑائی۔لیکن میں تو ہمیشہ رومال واپس کر دیا کرتا تھا کیوں کہ رومال نہ تو بگھارا جا سکتا ہے اور نہ مجھے زکام ہوا ہے۔

جس جمعہ کو انھیں جہانگیر کے مقبرہ کی سیر کو جانا تھا اس دن صبح ہی صبح ان کے یہاں پکوان پکنے لگے۔ان پکوانوں میں سب سے بڑھ چڑھ کر خجستہ نے حصہ لیا چونکہ کفگیر بار بار دیگچی سے ٹکرا رہا تھا مجھے معلوم ہو گیا کہ کوئی اناڑی باورچی اپنی پھرتی کی داد لینا چاہتا ہے اور اس گھر میں خجستہ کے علاوہ اور کون اناڑی ہو سکتا تھا۔

میں نے اپنی سائیکل برآمدے میں نکالی۔اُسے پرانی جراب سے صاف کیا اور اس کی ایک ایک کل اور پرزے کو''ایوننگ اِن پیرس ہیر آئل'' سے مالا مال کر دیا۔مجھے معلوم تھا کہ مقبرہ شہر سے کافی دُور ہے اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے اچھی خاصی سائیکلیں جواب دے جاتی ہیں۔

جب باورچی نے سائیکل نکال کر باہر گلی میں کھڑی کر دی تو میں نے ٹائی کی گرہ پر برش کرتے ہوئے کہا۔''میرا انتظار نہ کرنا۔میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔'' اُس نے ایک لمحہ کے لیے مجھے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر بڑبڑاتا ہوا اندر باورچی خانہ میں چلا گیا۔جہاں اس نے میرے حصے کا آٹا گوندھ کر ابھی چنگیری سے ڈھانپ رکھا تھا۔

پتہ نہیں کتنی دیر تک میں مقبرے کی چار دیواری میں گھاس کے پلاٹ پر لیٹا ان کا انتظار کرتا رہا۔جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بھی ادھر سیر کو نہ آیا میں چار دیواری کی محرابوں کو بار بار گن کر چار سے ضرب دیتا اور تین پر تقسیم کرتا رہا۔ایک بجے کے قریب صدر دروازے کے سامنے ایک تانگا رُکا اور اس میں سے تین برقعہ پوش عورتیں اُتریں۔جن میں اس ایک کا برقعہ سیاہ تھا اور اس کے سینڈل کی ایڑیاں گھسی ہوئی تھیں۔میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور خراماں خراماں مقبرے کی عمارت کو چل دیا۔سرو سہمے ہوئے مجھے اپنے قریب سے گذرتا ہوا دیکھ رہے تھے۔باغ سنسان تھا۔روشیں درختوں کے سوکھے ہوئے پتوں سے اٹی ہوئی تھیں اور فوارے کا پانی لے کر بہنے والی نہریں گھاس پھونس مٹی اور خشک وسبز ٹہنیوں کو اپنے کناروں میں دبائے آرام سے لیٹی تھیں اور مجھے ایسے لگا جیسے جہانگیر کی قبر کے اردگرد ہر قسم کی اور بہت سی قبریں ہوں۔لمبی،ترچھی،آڑی،گول،گہری۔

بوٹ اتارتے ہوئے میں نے لڑکے سے پوچھا۔''مجاور کہاں ہے؟'' تو اس نے زور سے ناک صاف کر کے کہا۔''جمعہ پڑھنے۔''

اس مختصر سے جواب کے بعد میں اس سے کچھ اور پوچھنے کی جرأت نہیں کی اور چپ چاپ مینار کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔اوپر پہنچ کر میں راوی کو ایک نظر دیکھا اور پھر سبزی مائل مٹیالے درختوں کے درمیان ان تینوں کا انتظار کرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور اوپر سے مجھے ایسے دکھائی دیتا تھا جیسے وہ صدیوں سے رینگ رہی ہوں اور فاصلہ ان کے سامنے ہولے ہولے پھیل رہا ہو۔وقت گذارنے کے لیے میں نے سگرٹ کا سہارا ڈھونڈا اور جب سگرٹ بالکل راکھ ہو گئی تو وہ نظروں سے معدوم ہو گئیں۔شاید وہ اسی لڑکے کی باتوں میں مصروف ہو گئی تھیں!

جب اس نے مینار کی سب سیڑھیاں چڑھ کر آخری مرتبہ لمبی ساری ''اف'' کی تو میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور سیڑھیوں کی ناکہ بندی کر کے کہنے لگا۔ ''معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔'' اس نے خوف اور حیرت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''آپ کون ہیں؟'' بہتر تھا، تم نے مجھ سے یہ سوال نہ پوچھا ہوتا۔ لیکن اب جو پوچھ لیا ہے تو سنو میں وہی چھوٹا سا تکیہ ہوں جسے تم بچپن میں اپنے سینہ سے لگائے پھرتی تھیں اور میں انہی رنگ برنگی چیزوں کا عکس ہوں جنہیں اوڑھ کر تم ملانی جی کے یہاں پڑھنے جاتی تھیں اور میں وہی شریر ماموں زاد بھائی ہوں جس کے متعلق تمہیں تمھاری کلاس فیلو کیسی کیسی مزے دار باتیں سنایا کرتی تھی۔ اب تمہی مجھ سے پوچھ رہی ہو میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟ میرا نام کیا ہے؟ یاد نہیں، جب تم بورڈنگ میں رہا کرتی تھیں تو تم نے مجھے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا اور تم اپنی استانی کی گرویدہ ہو گئیں۔ جب تم صبح سویرے سکول کے باغ سے کلیوں کی جھولی بھر کر اپنی استانی کے انتظار میں سائنس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس وقت تمہیں اسی کا انتظار ہوتا تھا جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا اور آج جب وہ خواب سچا ہو گیا ہے تو تم مجھ سے پوچھتی ہو کہ میں کون ہوں؟'' اس نے رونکھی ہو کر کہا۔ ''میں اپنی امّی کو پکارتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔''

میں نے کہا۔ ''تم ہر روز کوٹھے پر آ کر اپنی امّی کو پکارا کرتی ہو مگر بلاتی کسی اور کو ہو۔ ہر روز رات کو تم اپنے نرم اور گداز بستر سے اُٹھ کر میری طرف آنے کا قصد کرتی ہو۔ مگر تم نے اپنی پسلیوں کے اندر دل کا ایک ایسا طوطا پال رکھا ہے جو تمہیں بھیانک باتیں سنا سنا کر ڈرا دیتا ہے۔ کیا اس وقت تم اپنی امّی کو پکار کر یہ نہیں کہہ سکتی ہو کہ اس طوطے کی گردن مروڑ دیں؟ لیکن تم اپنی امّی کو پکارتی ہی کب ہو؟ تمہیں آواز دینا نہیں آتی۔ اب بھی تم اپنی امّی کو آواز کر مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ وہ احتلاجِ قلب کی مریض ہیں اور کئی گھنٹوں میں بھی یہ سیڑھیاں طے نہیں کر سکتیں۔ تم اس طرح کب تک اپنے آپ کو دھوکا دیتی رہو گی؟''

بارش کے دو موٹے قطروں ایسے بڑے آنسو اس کی ابریشمی پلکوں پر تھرکنے لگے اور اُس نے کہا۔ ''دھوکا! دھوکا!''

''ہاں'' میں نے جواب دیا۔ ''تم خود فریبی کے سنہرے جال خود ہی بنتی ہو اور اس میں خود اُلجھ کر رہ جاتی ہو۔ اس دن جب تمہارا کاڑھا ہوا سفید رومال ہمارے کوٹھے پر آ کر گرا تو تم نے جھلا کر کتنے زور سے کہا تھا۔ ''یہ کیا مصیبت ہے۔'' دراصل تمہارا مطلب تھا۔ ''یہ کتنی بڑی راحت ہے۔'' اور تم راحت کو اُجاگر کرنے کے لیے اس کے اردگرد مصیبتوں کے پگھلتے ہوئے انبار لگاتی رہی ہو۔ تم ہر مسرت کی طرف منفیانہ پیش قدمی کی ہے اور آج تک کرتی رہی ہو لیکن۔۔۔۔۔'' اس نے پنے برقعے کے نقاب کو انگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کون سی خوشی حاصل کی؟ مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرے فرشتوں کو بھی نہیں پتہ کہ تم کون ہو؟'' میں نے کہا۔ ''تم خوشیاں اکھٹی کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی چھولداریاں نصب کرتی ہو۔ مگر ان کی طنابیں بہت کمزور ہوتی ہیں ہر صبح جب سورج کی پہلی کرن دروازے کی جھری میں داخل ہو کر تمہیں بیدار کر کے کہتی ہے۔ اٹھو میں تمہارے لیے خوشیاں لائی ہوں تو تم ہڑبڑا کر اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ پھرتی ہو اور سراسیمہ ہو کر پوچھتی ہو۔ ''میری کل کی خوشیاں کہاں گئیں؟'' اور اس طرح ہر روز تمہاری مسرتوں کا بنک دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ آسمان پر جب میری نے تمہاری روح سے کہا کہ زمین پر پہنچ کر ہم ایک دوسرے سے ہم آغوش ہونگی تو تمہاری روح، روح القدس کے پروں کی طرح پھڑ پھڑائی اور تم مجھے لنکا کی پہاڑیوں میں ڈھونڈتی رہیں اور آج جب اس مینار پر ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں تو تم مجھے

پہچانے سے معذوری ظاہر کر رہی ہو۔ جب تم ٹائی فیڈ میں مبتلا ہو کر اپنی جان سے بیزار ہو گئی تھیں۔ اس وقت تمہارے منہ میں تھرمامیٹر لگا کر بالوں بھری کلائی پر۔ ''رولیکس'' کی گھڑی میں کون وقت دیکھتا رہا اور کون تمہارے ٹمپریچر کا چارٹ بھرتا رہا تھا۔ آج تم اس کلائی کو، اس گھڑی کو تو پہچان رہی ہو مگر اس آدمی سے نامانوس ہو!''

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''تم کلیم ہو؟ لیکن تم کلیم کیسے ہو سکتے ہو؟ تم تو۔ تم تو۔''

پھر اس نے کہا۔ ''میرا راستہ چھوڑ دو۔ میں نیچے جانا چاہتی ہوں۔''

میں نے جواب دیا۔ ''اس جگہ سے کوئی راستہ نیچے کو نہیں جاتا۔ ہم تو تحت الثریٰ میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ یوں کہو۔ آؤ اوپر چلیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے۔ تم اوپر نہیں جا سکو گی۔ تم نیچے نہیں جا سکو گی۔ تم نے یہ بات اسی لیے کہی ہے کہ تم یہاں کھڑی رہو اور میرے ذہن میں کبھی یہ خیال نہ آنے پائے کہ تم یہاں سے جا بھی سکتی ہو۔ تم نے مجھے ایک دفعہ بلایا تھا اور ٹال دیا تھا۔ اب دوسری مرتبہ بلایا ہے اور پھر جھجک رہی ہو۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو تمہیں بلاتا ہی نہیں۔''

اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں کب بلایا ہے؟ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم بھی یہاں ہو تو میں کبھی بھی اوپر نہ آتی بلکہ میں اس مقام پر ہی نہ آتی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تمہارے جیسے بدمعاش۔ بدمعاش۔۔۔۔۔'' اور پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اُس کا کندھا تھپک کر کہا۔ ''ہم جسے ظالم کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا اپنا پیار ہوتا ہے۔ ہم جسے مایوسی سمجھتے ہیں وہ ہماری ابھرتی ہوئی آس کی زمردیں کلغی ہوتی ہے۔ اور جسے تم بدمعاش کہتی ہو وہ تمہارا محبوب ہوتا ہے۔ اگر تمہیں کسی کی محبوبہ بننے کی سعادت نصیب ہوتی تو تم یقیناً ایسا نہ کہتیں۔ لیکن رونا تو یہی ہے کہ تم بچپن سے لے کر اب تک محبت کرتی آئی ہو اور بڑھاپے میں بھی اپنے عاشقانہ جذبات سے گریز نہ کر سکو گی۔ پتہ نہیں اب تم مجھے پہچانتے ہوئے بھی نہ پہچاننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟ تم نے بڑی مشکل سے ریل گاڑی کی چھت سے بلب چرایا ہے اور اب اسے پھر اسی جگہ لگا دینے کی سوچ رہی ہو۔ اس طرح سے تم دو چوریاں کرو گی۔ ایک ریل گاڑی کی اور ایک اس چور کی جس نے یہ قمقمہ چُرایا ہے۔''

اُس نے آنسو پونچھ کر کہا۔ ''میری پھوپھی بھی ساتھ ہیں اور میں ان کے لڑکے سے منسوب ہو چکی ہوں۔ تم کیوں۔۔۔۔۔''

میں نے کہا۔ ''تم اسی سے منسوب ہو جس کا انتظار تم نے سائنس روم کی سیڑھیوں پر کیا۔ تم اسی سے بیاہی جاؤ گی جس کے لیے تم لنکا کی پہاڑیوں میں ماری ماری پھری ہو۔ تمہارے پھوپھی زاد بھائی کا وجود محض ایک حادثہ ہے۔ موٹر پہلے زمزمہ کے چبوترے سے ٹکراتی ہے۔ حادثہ بعد میں اُسے الٹا کر اس کے مڈگارڈ اور بتیاں توڑ دیتا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''مجھے معلوم نہ تھا کہ دیوانہ مقبرۂ جہانگیر کے مینار میں چھپا ہوا ہے۔ اگر تم پاگل ہو تو۔۔۔۔۔''

میں نے جواب دیا۔ ''تم واقعی پاگل ہو۔ لیکن تم مینار میں چھپی ہوئی نہیں ہو بلکہ اس پر کھڑی ہو کر اردگرد کی چیزوں کو روشنی بخش رہی ہو۔ تمہی تو جہانگیر ہو جس نے اپنی سلطنت اپنی محبوبہ کے ہاتھوں شراب کے ایک پیالے اور پاؤ بھر کبابوں کو عوض بیچ دی تھی۔ لیکن تمہاری محبوبہ کو یہ سودا کس قدر مہنگا پڑا۔ اُدھر دیکھو! وہاں تمہاری محبوبہ اسی سودے میں گھاٹا کھا کر اتنی ملوں اور اس قدر پریشان ہے کہ اس کے تعویذ

کی خاک تک اس تجارت کی نذر ہو چکی ہے۔۔۔اب تم اس کے نام کو بھی خاک میں ملانے پر اتر آئی ہو اور اتنی بلندی پر چڑھ کر بولی دے رہی ہو۔''

اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور دھوئی دھائی آنکھوں پر سفیدی برفیلی ہو کر کافور کی ٹکیاں بن گئی تھی۔اس نے اپنے لب کھولے اور ہارمونیم کے پردوں ایسے دانتوں میں اپنی سرخ سرخ زبان دبالی۔پھر اپنے گوشۂ چشم سے مجھے دیکھا اور بولی۔''تم ہمارے پڑوسی تو نہیں؟''

میں نے کہا۔''ہاں تم میری پڑوسی ہو اور میرے مکان کے گرد جو کوئی بھی رہتا ہے وہ میرا پڑوسی ہے۔پر میں تو اس طوطے کا ہمسایہ ہوں جو ہر رات تمہیں مجھ سے بدظن کرنے کے لیے ایک کہانی سنایا کرتا ہے۔اس کی ہر کہانی میرے گھر کو دروازوں میں ایک ایک میخ بن کر گڑی ہوئی ہے اور میرے نکلنے کا راستہ بند ہو گیا ہے۔تم ہر شام وہ میخیں اکھاڑنے آتی ہو مگر ایک نئی کھونٹی ٹھونک کر چلی جاتی ہو۔اور میں صبح سے شام تک دیواروں کو ناخنوں سے کھرچ کھرچ کر نقب لگانے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔لیکن تم جانتی ہو کہ میرے گھر کی دیواریں ہاتھی کے کھال سے بنی ہوئی ہیں جو قطبی ستارہ نکلتے ہی اپنے زخموں کو رفو کر لیتی ہیں۔''

اس نے ٹھوڑی کے نیچے برقعے کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا۔''تم بڑی مزیدار باتیں کرتے ہو۔یہ تم نے کہاں سے سیکھیں؟''

میں نے کہا۔''تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنا سبق بھولا نہیں۔میں بڑا ہونہار شاگرد ہوں اور اپنے معلم کے سامنے آموختہ بڑے حسن اور سلیقہ سے دہرا سکتا ہوں''

اس پر وہ مسکرانے لگی اور اس کے گالوں میں دو ننھے گڑھے پیدا ہو گئے۔رنگے ہوئے ناخنوں والا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولی۔''مجھے معلوم نہ تھا کہ تم بھی اسی قدر بیقرار ہو۔میں نے سوچا۔دیواریں کھرچتے کھرچتے تمہاری انگلیوں میں ناسور ہو جائیں گے اور تم اجگر کی طرح کینچلی چڑھا کر میٹھی نیند سو جاؤ گے۔لیکن ایسا نہیں ہوا۔تم دھن کے پکے نکلے۔۔۔آؤ اب ہم دونوں مل کر اس طوطے کر گردن مروڑ دیں۔''

میں نے کہا۔''اس طوطے کو نہ مارنا۔اس میں میری جان ہے۔اگر میری جان نکل گئی تو تم مر جاؤ گی۔''

اس نے کہا۔''مجھے اپنی زندگی کی پروا نہیں۔''

میں نے جواب دیا۔''مجھے بھی اپنی زندگی کی پروا نہیں۔لیکن مجھے طوطے کی زندگی عزیز ہے۔''

اس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔''لیکن میرا پھوپھی زاد بھائی اس طوطے کو مار ڈالے گا۔کیوں کہ اس کی ناک بلی جیسی ہے اور اس کی آنکھیں شکرے کی طرح تیز ہیں۔''

میں نے اس کے سر کو کندھے سے لگا کر تھپکا اور کہا۔''تم فکر نہ کرو۔وہ اسے گزند نہیں پہنچا سکتا۔یہ بات الگ ہے کہ وہ بھی جلن میں آ کے مینا پال لے۔لیکن ایسا بھی کبھی نہ ہوگا۔وہ ایک تاجر ہے اور تاجر ایسی چیزیں نہیں پالا کرتے جن میں خاصا نفع نہ ہو۔''

اس کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں اور اس نے میری ٹائی پر ناک رگڑتے ہوئے کہا۔''ایک مرتبہ جب میں کمرہ امتحان میں

سوال حل کر رہی تھی تو تم نے اچانک آن کر مجھے گدگدا دیا تھا اور میں نے جل کر کہا تھا۔تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ یہاں نہ آوں گا لیکن اب میرا وقت خراب کرنے کو یہاں بھی پہنچ گئے ہو تو تم نے قسم کھا کر جواب دیا تھا کہ میں نہیں آیا ہوں تمہیں وہم ہو رہا ہے۔اس پر میں نے تنگ آ کر کہہ دیا تھا کہ کتنا جھوٹ بولتے ہیں آپ جہنم میں جائیں گے۔کیا تم میرا مطلب سمجھے تھے؟''

میں نے سر ہلا کر کہا۔''نہیں''

اس نے اپنا ماتھا میری چھاتی پر ہولے ہولے مارتے ہوئے کہا۔''آپ سے ملنے کی تمنا پہلے ایک چنگاری بن کر سلگتی رہی۔اس کے بعد فوراً بھڑک اُٹھی اور آگ کے نارنجی شعلوں نے مجھے دن رات جلانا شروع کر دیا۔۔۔۔میں آپ کو اسی جہنم میں بھجنا چاہتی تھی۔''

میں نے کہا۔''تمھاری باتیں تو پہلیاں ہیں اور صرف سیدھی سادی باتیں سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔تمھارے اس معمہ کو کیونکر حل کرتا!''

پھر ہم دونوں ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔میں نے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔جس میں وہ اپنی انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور آہستہ آہستہ کچھ گنگناتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہمیں سیڑھیوں سے قدموں کی چاپ اور پھولے ہوئے سانسوں سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔میں اس گود میں سے سر اٹھا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔گھبرائی ہوئی نگاہوں سے میں نے اس کو دیکھا۔لیکن اس کی آنکھوں میں سکون اور لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔اس نے اپنا بایاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔''یہ ہیرے کی انگوٹھی ہے اور میری زندگی ختم کرنے کے لیے کافی ہوگی۔اس طرح اپنی امّی اور اپنی پھوپھی کی طعن آمیز باتیں سننے سے بچ جاؤں گی۔''یہ کہہ کر اس نے اپنا الٹا ہاتھ لبوں کی طرف بڑھایا لیکن میں نے اس کی کلائی مضبوطی سی پکڑ لی اُس نے زور لگایا اور اسی زور آزمائی میں ہم اٹھ کھڑے ہو گئے۔اپنی ساری قوت سے اُسے فرش پر گرا کر ایک عصمت مآب لڑکی عفت اور عزت برقرار رکھنے کے لیے میں مینار کی بلندی سے نیچے کود گیا۔

عجیب بادشاہ

کراچی کافی ہاؤس کی سیڑھیاں اتر کر جب میں اپنی کرائے کی سائیکل کا تالا کھولنے لگا تو کسی نے پیچھے سے آ کر میری آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ سیدھے کھڑے ہو کر میں اس ہاتھ پر دیر تک ہاتھ پھرتا رہا لیکن پتہ نہ چلا کہ کون ہے۔ لمبی لمبی مضبوط انگلیاں، پشت دست پر سخت بال، بڑھے ہوئے ناخن، سخت گرفت کی وجہ سے کلائی پر ابھری ہوئیں نسیں اور سرسوں کے تیل کی سگریٹ میں ملی جلی خوشبو۔

''معظم''۔ میں نے کہا۔

مگر کوئی جواب نہ ملا۔

''قمر۔''

لیکن اس مرتبہ بھی کوئی نہ بولا۔

''ممتاز۔''

اب بھی ہاتھ میری آنکھوں پر ہی رہا۔

ایک ایک کر کے میں اپنے تمام زندہ اور مردہ دوستوں کے نام گنوائے مگر میری آنکھوں سے وہ ہاتھ نہ ہٹا۔ پھر میں نے اپنا نام لے کر کہا۔ ''اب چھوڑیے صاحب کہیں غلط فہمی میں تو میری آنکھیں بند نہیں کر رکھیں۔'' اس پر زور سے ہنسا اور ہاتھ ہٹا لیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ زمان میلی سی نیلے رنگ کی اچکن پہنے مسکرا رہا تھا۔ میں اپنی فائل زمین پر پھینک کر اس سے لپٹ گیا۔ پورے بارہ سال ایک دوسرے سے جدا رہنے کی مکافات ہم دنوں کی کہ دیر تک ایک دوسرے سے لپٹے رہے اور پٹڑیوں پر چلنے والے راہ گیر پیچھے مڑ مڑ کر دُور تک ہمیں دیکھتے رہے۔ میں نے ٹھوڑی اس کے کندھے پر رگڑتے ہوئے پوچھا۔ ''اتنا عرصہ کہاں رہے۔ ظالم؟'' تو اس نے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کہا۔ ''آبادان''۔

''آبادان۔'' میں نے ہٹ کر پوچھا۔

''ہوں'' زمان نے اپنے ہاتھ اچکن کی جیبوں میں ڈال لیے اور بولا۔ ''تم جدا ہو کر چند مہینے تو بمبئی میں گذارے۔ اس کے بعد اینگلو ایرانین آئل کمپنی میں ملازم ہو کر آبادان چلا گیا اور اتنا عرصہ ہیں رہا اور مجھے وہاں سے لوٹے ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا۔''

''مگر تم نے آج تک مجھے کوئی خط کیوں نہ لکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''خط'' ! اس نے مسکرانے کی کوشش کی ''یار میں نے لکھا ہی نہیں۔ کسی کو بھی نہیں لکھا۔ تمہیں معلوم ہے۔ یار مجھے خط لکھنے کی عادت نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ عادت نہیں تو نہ سہی۔ مجھے لکھا ہاتا!''

اس پر وہ مسکرانے لگا اور بولا۔ ''اب جو مل گئے ہو تو سارے خط زبانی سنا دوں گا۔ لیکن اس وقت مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے سٹر ٹپو مائی سین کا پرمٹ لینا ہے اور دفتر ابھی بند ہو جائیں گے۔''

''سڑ پٹو مائی سین کا پرمٹ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں'' وہ آہستہ سے بولا۔ ''ڈاکٹر نے یہی دوا تجویز کی ہے۔۔۔اور۔۔۔۔یار۔۔۔اچھا بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ مجھے اپنی رہائش گاہ کا پتہ بتلا دو۔''

میں نے ڈائری سے ایک ورق پھاڑ کر اس پر اپنا پتہ لکھ دیا اور اس کے دوسری طرف ایک چھوٹا سا نقشہ بنا کر بھی اسے سمجھا دیا کہ صدر ٹرام جنکشن کے سامنے جو کھلی سڑک ہے۔ اس کے پہلے بائیں موڑ پر ایک مسجد ہے۔ مسجد کے ساتھ ایک لائبریری ہے اور لائبریری سے چند قدم کے فاصلہ پر دائیں ہاتھ بنجارا ہوٹل ہے۔ اس کے آٹھویں کمرے میں رہتا ہوں۔ زمان چلنے لگا تو میں نے کہا ''یار تمہارے چلے جانے کے بعد سیما بھی اچانک غائب ہو گئی اور اس کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔''

''اچھا''! اس نے بے پروائی سے کہا اور بولا۔ ''یار، یہ لڑکیاں بھی عجیب بادشاہ ہوتی ہیں کہ وقتے بہ برنجند دگاہے بدشنامے خلعت دہند۔۔۔'' لیکن یار، اب مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں کل شام کو آؤں گا۔ پانچ چھ بجے میرا انتظار کرنا۔''

وہ چلا گیا تو میں نے سائیکل کا تالا کھولتے ہوئے سوچا۔ ''سڑ پٹو مائی سین! بادشاہ لڑکیاں! یہ کیا بات ہوئی!''

زمان اور میں تین سال تک اکٹھے ایک ہی کالج اور ہوسٹل کے ایک ہی کمرے میں رہے تھے۔ تین سال کی اس چھوٹی سی مدت میں اس نے مجھے کس کس طرح تنگ کیا میں بیان نہیں کر سکتا۔ ظالم کا ذہن اچھا تھا۔ امتحان کے قریب آ کر چند دن پڑھائی کرتا اور پاس ہو جاتا۔ مجھے شروع سے رٹنے کی عادت تھی۔ لنگر لنگوٹے کس کر آدھی آدھی رات تک رٹا لگاتا کرتا۔ وہ اپنے بستر میں لیٹے سگریٹ پیتے ہوئے مجھے اس طرح جپ کرتے دیکھ کر بہت ہنستا اور اونچے اونچے پشتو کے شعر گانے لگتا۔ بے حد ضدّی اور سر پھرا قسم کا آدمی واقع ہوا تھا۔ جو بات جی میں آتی بلا سوچے سمجھے کہہ دیتا۔ تمیز کے نام سے بہت چڑتا تھا۔ مانگنا اس کے مذہب میں حرام تھا۔ کسی بات پر منہ سے نہ نکل گئی تو اس کا ہاں میں تبدیل ہونا ممکنات میں سے نہ تھا۔ تاش کبھی شرط بدلے بغیر نہ کھیلتا تھا اور جو ہارنے والے کے پاس پیسے نہ ہوئے تو اس کی کتابیں ضبط ہیں یا پتلون! اپنے پاس رقم نہیں تو کھیل میں شریک ہی نہ ہوتا تھا۔ سگریٹ سلگانے کو ماچس نہیں تو مجھ سے کبھی نہیں مانگی۔ منہ میں سگریٹ دبائے چوس رہا ہے اور سر ہلا رہا ہے۔ میں نے چائے کی دو پیالیاں بنا کر کہا۔ ''زمان بھائی، چائے پیو'' تو اس نے آئینہ میں اپنے مہاسے کو بلیڈ سے چھیلتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تھوڑی سی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بھئی نہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''بھئی کا کیا مطلب۔'' جھلا کر بولا۔ ''بھئی نہیں کا مطلب کہ نہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''وجہ؟'' بولا۔ ''نہیں۔'' میں نے پوچھا۔ ''نہیں کیا؟'' کہنے لگا۔ ''نہیں جو ہوتی ہے کہ بس نہیں۔''

اسے آدمی کے ساتھ تین سال گذارنے جہنم ہیں کہ نہیں! باکسنگ میں یونیورسٹی چیمپئن شپ کا انعام ملا تو اس بات پر اڑ گیا کہ انعام دینے والے سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ اپنی ہمت سے کپ لیا ہے۔ ہاتھ کیوں ملاؤں۔ چنانچہ ایسے ہی کیا۔ انعام لے کر ہاتھ ملائے بغیر واپس آ گیا۔۔۔۔۔ڈاکیے نے ایک بیرنگ خط لا کر کہا۔ ''دو آنے دیجیے۔'' اس نے لفافہ دیکھے بغیر جواب دیا۔ ''خط واپس کر دو میں نہیں لیتا۔'' میں نے پوچھا تو بولا۔ ''دو آنے نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یار مجھ سے لے لو۔ پھر لوٹا دینا۔'' پوچھنے لگا۔ ''کیوں لوں؟'' میں نے کہا۔ ''اس لیے

کہ خط لے سکو۔'' بولا۔ ''میں نہیں لیتا۔'' میں نے نہیں کا لفظ سن کر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ شیروں کے پسر شیر ہی ہوتے ہیں جہاں میں۔ بھلا قبلہ گاہی طبعیت بھی ایسی ہی ہے؟'' اس پر ہنسنے لگا تو میں نے شیر ہو کر کہا۔ ''تو بلاؤں ڈاکیے کو۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا اور تاش پھینٹنے لگا۔

کالج میں فیس داخل کرنے کا دن آتا تو دفتر ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ لڑکیاں اس دھکم پیل میں فیس دینے سے گھبراتی تھیں اور ان کی فیسیں لڑکے جا کر داخل کرواتے تھے۔ اس طرح ایک مہینہ کے بعد ان سے کھل کر گفتگو کرنے کا اچھا خاصا موقع مل جاتا تھا۔ وہ اپنے پرس سے روپے نکالتیں اور گن کر کسی کلاس فیلو کو دے دیتیں۔ وہ انھیں گنتا اور ضرور کہتا کہ ایک روپیہ کم ہے۔ اس طرح لڑکی اور لڑکے کے چہروں پر ایک ساتھ ایک سی دو مسکراٹیں پھیل جاتیں۔ فیس ادا کر کے پھر انہیں حساب دیا جاتا۔ ایک آدھ آنہ یہ کہہ کر رکھ لیا جاتا کہ یہ ہماری سگرٹ کے لیے ہے اور پھر وہ اکنّی کئی دنوں تک اس لڑکی کے سفید چھلّے کی طرح دکھائی دیتی رہتی۔ ہاسٹل میں کئی ایسے باذاق لڑکے بھی تھے جن کے پاس بہت سی ایسی آنگوٹھیاں جمع ہوگئی تھیں۔ ہماری کلاس میں ہر ایک لڑکے کی یہی خواہش ہوتی کہ سیما اسے فیس لے جانے کے لیے منتخب کرے مگر وہ صرف اسلم کے ہاتھ اپنی فیس دفتر بھجواتی۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ اسلم نہیں تھا تو سیما نے زمان کو ستّر روپے دے کر کہا۔ ''میری فیس داخل کروا دیجئے۔'' زمان نے کچھ کہے بغیر روپے لے لیے اور سیدھا ہوسٹل چلا آیا۔ سیما برآمدے میں گھنٹہ بھر تک رسید کا انتظار کرتی رہی مگر رسید لانے والا تو اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسرے دن زمان نے اکہتّر روپے سیما کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ ''کل مجھے نیند آ گئی تھی اور میں فیس داخل نہ کرا سکا۔ آپ اپنے روپے لے لیجیے اور یہ ایک روپیہ لیٹ فیس کا جرمانہ ہے۔'' سیما نے کھینچ کر ایک روپیہ دیوار سے دے مارا تو زمان نے کہا۔ ''ایسے تو نہیں ٹوٹے گا۔'' اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

کالج میں پروفیسر دیس راج سے اس کی جان جاتی تھی۔ یہ پرانی وضع کے معمّر پروفیسر تھے۔ چست پاجامہ، اچکن پہنے ململ کی پگڑی باندھ کر کالج آتے۔ ایک ہاتھ میں بورڈ صاف کرنے کا ڈسٹر ہوتا اور دوسرے میں چاکوں کا ڈبہ۔ دونوں ہاتھ چاک کی سفیدی سے بھرے ہوتے اور اچکن پر بھی جگہ جگہ ان ہاتھوں کے نشان ہوتے۔ زمان کو وہ ''ہینگ والا'' کہا کرتے تھے اور یہی انہیں بجائے پروفیسر صاحب کے باباجی کہا کرتا۔ باباجی کے سامنے اس نے کبھی سگریٹ نہیں پیا، اونچے نہیں بولا، ضّد نہیں کی اور کسی بات سے انکار نہیں کیا۔

ڈائی نیمکس کی کاپیاں دیکھتے ہوئے وہ زمان کو بلاتے اور اس کا کان پکڑ کر آہستہ آہستہ مسلتے جاتے اور کہتے۔ ''یہ کیا کیا ہینگ والے، یہ کیا کیا؟'' زمان کے منہ میں گھنگھنیاں بھری ہیں، آنکھیں نیچی ہیں، جواب دینے کی سکت نہیں اسی طرح کمان بنا کھڑا ہے۔ اگلا صفحہ پلٹ کر باباجی اس کا کان چھوڑ کر پیٹھ ٹھونکتے اور خوش ہو کر کہتے۔ ''میرا ہینگ والا ہے لائیق۔ لیکن پاپی پڑھتا نہیں! مکّے بازی پر جان دیتا ہے۔'' پھر اس کی کاپی بند کر کے کہتے۔ ''جا، میرے لیے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس لا۔'' اور زمان فخر سے سر اونچا کر کے دروازے کی طرف بڑھتا جیسے کسی نے دو جہان کی بادشاہی اسے بخش دی ہو۔

ایک مرتبہ سیما اور ساوتری پتہ نہیں کونسی کتاب لائبریری سے لیے نے گیں تو لائبریرین نے انہیں بتایا کہ وہ کتب تو دیر سے زمان صاحب کے پاس ہے۔ وہ سیدھی ہوسٹل پہنچیں۔ میں رٹا لگانے میں مصروف تھا اور زمان حسبِ معمول رضائی کو چوڑائی کے رخ اوڑھے